

عنا صدفی

عشق نامہ

عشق نامہ

عرفان صدیقی

عشق نامہ

عرفان صدیقی

C عرفان صدیقی

عرفان صدیقی

عشق نامہ

ISHQNAMA BY IRFAN SIDDIQUI

Price : Rs 100

ناشر :	مصنف
اشاعت :	۱۹۹۷ء
تعداد :	۶۰۰
قیمت :	۱۰۰ روپے
طباعت :	عفیف پرنٹرس دلی۔ ۶
کمپوزنگ :	عفیف ڈزائننگ گروپ

یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے جزوی تعاون سے شائع ہوئی

زیر اہتمام

شبانہ پبلی کیشنز ۲۰۱۳ محلہ قبرستان ترکمان گیٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

خُدا کے خزانوں کے نام

”۔۔۔۔۔حواً جب زمین پر آئیں تو اپنے سنوارے
 ہوئے گیسوؤں کو کھولا۔ خُدا نے ایک ہوا
 بھیجی جس نے اس خوشبو کو مغرب و مشرق
 تک پہنچا دیا۔ تمام خوشبوؤں کی اصل اسی
 سے ہے۔۔۔۔۔“

(امام جعفر صادقؑ)

جام ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے
غالب



خانہ درد ترے خاک بہ سر آگئے ہیں
اب تو پہچان کہ ہم شام کو گھر آگئے ہیں

جان و دل کب کے گئے ناقہ سواروں کی طرف
یہ بدن گرد اڑانے کو کدھر آگئے ہیں

رات دن سوچتے رہتے ہیں یہ زندانی ہجر
اُس نے چاہا ہے تو دیوار میں در آگئے ہیں

اُس کے ہی ہاتھ میں ہے شاخِ تعلق کی بہار
چھو لیا ہے تو نئے برگ و ثمر آگئے ہیں

ہم نے دیکھا ہی تھا دُنیا کو ابھی اُس کے بغیر
لیجئے بیچ میں پھر دیدہ تر آگئے ہیں

اتنا آساں نہیں فیصلہ ترک سفر
پھر مری راہ میں دو چار شجر آگئے ہیں

نیند کے شہر طلسمات میں دیکھیں کیا ہے
جا گتے میں تو بہت خواب نظر آگئے ہیں



اُس نے کیا دیکھا کہ ہر صحرا چمن لگنے لگا
کتنا اچھا اپنا من ، اپنا بدن لگنے لگا

جنگلوں سے کون سا جھونکا لگا لایا اسے
دل کہ جگنو تھا چراغِ انجمن لگنے لگا

اس کے لکھے لفظ پھولوں کی طرح کھلتے رہے
روز ان آنکھوں میں بازارِ سمن لگنے لگا

اول اول اس سے کچھ حرف و نوا کرتے تھے ہم
رفتہ رفتہ رائگاں کارِ سخن لگنے لگا

جب قریب آیا تو ہم خود سے جدا ہونے لگے
وہ حجابِ درمیانِ جان و تن لگنے لگا

ہم کہاں کے یوسف ثانی تھے لیکن اس کا ہاتھ
ایک شب ہم کو بلاے پیرہن لگنے لگا

تیرے وحشی نے گرفتاری سے بچنے کے لیے
رم کیا اتنا کہ آہوے ختن لگنے لگا

ہم بڑے اہل خرد بنتے تھے یہ کیا ہو گیا
عقل کا ہر مشورہ دیوانہ پن لگنے لگا

کر گیا روشن ہمیں پھر سے کوئی بدر مُنیر
ہم تو سمجھے تھے کہ سورج کو گھن لگنے لگا



تیرے تن کے بہت رنگ ہیں جان من، اور نہاں دل کے نیرنگ خانوں میں ہیں
لامسہ، شامہ، ذائقہ، سامعہ، باصرہ سب مرے راز دانوں میں ہیں

اور کچھ دامنِ دل کشادہ کرو، دوستو، شکرِ نعمت زیادہ کرو
پیڑ، دریا، ہوا، روشنی، عورتیں، خوشبوئیں سب خدا کے خزانوں میں ہیں

ناقہِ حُسن کی ہم رکابی کہاں، خیمہ ناز میں باریابی کہاں
ہم تو اے بانوے کشورِ دلبری، پاسداروں میں ہیں سار بانوں میں ہیں

میرے اندر بھی ہے ایک شرِ دگر، میرے متاب اک رات ادھر سے گزر
کیسے کیسے چراغِ ان درپچوں میں ہیں، کیسے کیسے قمرِ ان مکانوں میں ہیں

اک ستارہ ادا نے یہ کیا کر دیا، میری مٹی سے مجھ کو جدا کر دیا
ان دنوں پاؤں میرے زمیں پر نہیں اب مری منزلیں آسمانوں میں ہیں



لپٹ سی داغِ کہن کی طرف سے آتی ہے
جب اک ہوا ترے تن کی طرف سے آتی ہے

میں تیری منزلِ جاں تک پہنچ تو سکتا ہوں
مگر یہ راہ بدن کی طرف سے آتی ہے

یہ مُٹک ہے کہ محبت مجھے نہیں معلوم
مہک سی میرے ہرن کی طرف سے آتی ہے

پہاڑ چپ ہیں تو اب ریگ زار بولتے ہیں
ندائے کوہِ ختن کی طرف سے آتی ہے

کسی کے وعدہ فردا کے برگ وبار کی خیر
یہ آگ بھر کے بن کی طرف سے آتی ہے

بگوں کے کھوئے ہوؤں کو پکارتا ہے یہ کون
صدا تو خاکِ وطن کی طرف سے آتی ہے



شہاب چہرہ کوئی گم شدہ ستارہ کوئی
ہوا طلوع افق پر مرے دوبارہ کوئی

اُمیدواروں پہ کھلتا نہیں وہ بابِ وصال
اور اس کے شہر سے کرتا نہیں کنارہ کوئی

مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اُس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

کہاں سے آتے ہیں یہ گھر اُجالتے ہوئے لفظ
چھپا ہے کیا مری مٹی میں ماہ پارہ کوئی

بس اپنے دل کی صدا پر نکل چلیں اس بار
کہ سب کو غیب سے ملتا نہیں اشارہ کوئی

گماں نہ کر کہ ہوا ختم کارِ دل زدگاں
عجب نہیں کہ ہو اس راہ میں شرارہ کوئی

اگر نصیب نہ ہو اُس قمر کی ہم سفری
تو کیوں نہ خاکِ گذر پر کرے گزارہ کوئی



ہم سے وہ جان سخن ربطِ نوا چاہتی ہے
چاند ہے اور چراغوں سے ضیا چاہتی ہے

اُس کو رہتا ہے ہمیشہ مری وحشت کا خیال
میرے گم گشتہ غزالوں کا پتا چاہتی ہے

میں نے اتنا اُسے چاہا ہے کہ وہ جان مراد
خود کو زنجیرِ محبت سے رہا چاہتی ہے

چاہتی ہے کہ کہیں مجھ کو بہا کر لے جائے
تم سے بڑھ کر تو مجھے موجِ فنا چاہتی ہے

روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر، یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

ہم پرندوں سے زیادہ تو نہیں ہیں آزاد
گھر کو چلتے ہیں کہ اب شام ہوا چاہتی ہے

ہم نے ان لفظوں کے پیچھے ہی چھپا یا ہے تجھے
اور انھیں سے تری تصویر بنا چاہتی ہے



سو ہم نذرِ فراموشی یہ سب اشعار کردیں گے
وہ ہم سے کہہ رہا ہے کیا مجھے بیمار کردیں گے

وہی سچ ہے جو آنکھوں سے ہویدا ہو تا رہتا ہے
اگر ہونٹوں سے پوچھو گے تو وہ انکار کردیں گے

بدن کی ریت پر اب تک اسی وعدے کا سایہ ہے
اب آئیں گے تو تیرے دشت کو گلزار کر دیں گے

بتانِ شر سے یہ دل تو زندہ ہو نہیں سکتا
بہت ہوگا تو میری خواہشیں بیدار کردیں گے

قیامت استعارہ ہے اشارہ میرے قاتل کا
کہ ہم ابرو ہی کیا سارا بدن تلوار کردیں گے

انھیں دیوار جاں ہی سے الجھنے دو کہ وحشی ہیں
اگر چھیڑا تو دیوار جہاں مسمار کر دیں گے

کسی کو شہر میں سیل بلا کی زد پہ آنا ہے
چلو یہ کام بھی میرے درو و دیوار کردیں گے



ڈار سے اس کی نہ عرفان جدا کر اس کو
کھول یہ بند وفا اور رہا کر اُس کو

نظر آنے لگے اپنے ہی خط و خالِ زوال
اور دیکھا کرو آئینہ بنا کر اُس کو

آخرِ شب ہوئی آغازِ کہانی اپنی
ہم نے پایا بھی تو اک عمر گنوا کر اُس کو

دیکھتے ہیں تو لہو جیسے رگیں توڑتا ہے
ہم تو مرجائیں گے سینے سے لگا کر اُس کو

تیرے دیرانے میں ہونا تھا اُجالا نہ ہوا
کیا ملا اے دل سقا ک جلا کر اُس کو

اور ہم ڈھونڈتے رہ جائیں گے خوشبو کا سراغ
ابھی لے جائے گی اک موج اُڑا کر اُس کو



وہ ہلالِ ماہِ وصال ہے دلِ مہرباں اُسے دیکھنا
پسِ شامِ تن جو پکارنا سرِ بامِ جاں اُسے دیکھنا

مری عاشقی مری شاعری ہے سمندروں کی شناوری
وہی ہم کنار اُسے چاہنا وہی بے کراں اُسے دیکھنا

وہ ستارہ ہے سرِ آسماں ابھی میری شامِ زوال میں
کبھی میرے دستِ کمال میں تہہ آسماں اُسے دیکھنا

وہ ملا تھا نخلِ مراد سا ابھی مجھ کو نجدِ خیال میں
تو ذرا غبارِ شمال میں مرے سارباں اُسے دیکھنا

نہ ملے خبر کبھی دوستو مرے حال میرے ملال کی
تو بچھڑ کے اپنے حبیب سے پس کا رواں اُسے دیکھنا



تشنہ رکھا ہے نہ سرشار کیا ہے اُس نے
میں نے پوچھا ہے تو اقرار کیا ہے اُس نے

گر گئی قیمتِ شمشادِ قداں آنکھوں میں
شہر کو مصر کا بازار کیا ہے اُس نے

وہ یہاں ایک نئے گھر کی بنا ڈالے گا
خانہ درد کو مسمار کیا ہے اُس نے

دیکھ لیتا ہے تو کھلتے چلے جاتے ہیں گلاب
میری مٹی کو خوش آثار کیا ہے اُس نے

دوسرا چہرا اس آئینے میں دکھائی نہ دے
دل کو اپنے لیے تیار کیا ہے اُس نے

حرف میں جاگتی جاتی ہے مرے دل کی مراد
دھیرے دھیرے مجھے بیدار کیا ہے اُس نے

میرے اندر کا ہرن شیوہ رم بھول گیا
کیسے وحشی کو گرفتار کیا ہے اُس نے

میں بہر حال اُسی حلقہ زنجیر میں ہوں
یوں تو آزاد کئی بار کیا ہے اُس نے

اب سحر تک تو جلوں گا کوئی آئے کہ نہ آئے
مجھ کو روشن سر دیوار کیا ہے اُس نے



اک ہوا آئی کہ بر ہم ہوا مے خانہ لب
لب تک آیا بھی نہیں تھا ابھی پیانہ لب

رات کی بات کوئی اس کے سوا یاد نہیں
قصہ شب میں اگر سچ ہے تو افسانہ لب

سر آشوب ہوا بوسہ بہ پیغام کی فکر
تو بھی کیا چیز ہے میرے دل دیوانہ لب

جسم سے روح تلک راہ نوردی کے لیے
ہو عنایت مرے ہونٹوں کو بھی پروانہ لب

کاسۂ لب میں کہاں ڈھونڈ رہی ہو اس کو
ہم نے آنکھوں میں چھپا رکھا ہے دردانۂ لب

جنبش لب ہو تو نقدِ دل و جاں دیتے ہیں
ہم نئے باج گزاروں میں ہیں سلطانۂ لب

کچھ نہ کچھ حرفِ عنایت کا صلہ دیں تم کو
اذن ہو جائے تو حاضر کریں نذرانۂ لب

وہ تو یہ کہیے کہ اک نام سخن میں آیا
پھول کھلتے ہی کہاں تھے سرِ ویرانۂ لب



✓ تمام تاب و تب عاشقی بہانہ ترا
بدن کسی کا بھی ہو وصل جادوانہ ترا

ترے سوا کوئی کیسے دکھائی دے مجھ کو
کہ میری آنکھوں پہ ہے دست غائبانہ ترا

جو رنگ خواب میں دیکھے نہیں وہ سامنے تھے
کھلا ہوا تھا نظر پر نگار خانہ ترا

وہ میرے ہاتھوں میں آئے ہوئے زمین و زماں
وہ میری خاک پہ بکھرا ہوا خزانہ ترا

میں ایک موج میں غرقاب ہو چکا تھا مگر
چھلک رہا تھا ابھی ساغرِ شبانہ ترا

میں بجھتا جاتا تھا لیکن کنارِ جوئے وصال
جھمک رہا تھا ابھی گوہرِ یگانہ ترا

میں تجھ سے بچ کے بھی کیا دوسروں کے کام آیا
تو اب ملے گا تو بن جاؤں گا نشانہ ترا

بس ایک جست میں ہوتی ہے طے مسافتِ بحر
سمندرِ طبع کو کافی ہے تازیانہ ترا



ذرا سا وقت کہیں بے سبب گذارتے ہیں
چلو یہ شام سر جوئے لب گذارتے ہیں

تو اک چراغِ جہانِ دگر ہے کیا جانے
ہم اس زمین پہ کس طرح شب گذارتے ہیں

ہمارا عشق ہی کیا ہے، گذارنے والے
یہاں تو نذر میں نام و نسب گذارتے ہیں

خراج مانگ رہی ہے وہ شاہ بانوئے شر
سو ہم بھی ہدیہ دستِ طلب گذارتے ہیں

سنا تو ہوگا کہ جنگل میں مور ناچتا ہے
ہم اس خرابے میں فصلِ طرب گذارتے ہیں



جہانِ گم شدگاں کے سفر پہ راضی ہوں
میں تیرے فیصلہ معتبر پہ راضی ہوں

ابھی مرا کوئی پیکر نہ کوئی میری نمود
میں خاک ہوں ہنرِ کوزہ گر پہ راضی ہوں

یہی خیال مجھے جگمگائے رکھتا ہے
کہ میں رضاائے ستارہ نظر پہ راضی ہوں

عجیب لوگ تھے مجھ کو جا کے چھوڑ گئے ✓
عجیب دیا ہوں طلوعِ سحر پہ راضی ہوں



چمک ہے عشق کی تیرہ شبی میں پہلے سے
میں جل رہا ہوں اسی روشنی میں پہلے سے

چلی تھی خاک بھی میری وہیں بکھر نے کو
ہوا نے رقص کیا اُس گلی میں پہلے سے

کوئی بھی حلقہ زنجیر ہو اسیر ہوں میں
ترے ہی سلسلہ دلبری میں پہلے سے

ترے وصال سے کچھ نرم نہیں اُمید وصال
سو ہم بلاک ہوئے ہیں خوشی میں پہلے سے

ڈبو دیا مجھے میرے لہو نے آخر کار
بھنور تو سوئے ہوئے تھے ندی میں پہلے سے

کھلا کہ تیرا ہی پیکر مثالِ صورتِ سنگ
چھپا ہوا تھا مری شاعری میں پہلے سے



آجا کبھی ہم گوشہ نشیناں کے لیے بھی
شانہ ہو کوئی دیدہ گریاں کے لیے بھی

✓ کیا سیر ہے جاناں یہ ترا پیرہن تنگ
تن چاہیے پیرہن جاناں کے لیے بھی

یہ جوے تنگ آب ہمیں راس نہ آجائے
موقع ہے ابھی ابر گریزاں کے لیے بھی

✓ سب صرف نہ کر موسم گل پر دل ناداں
کچھ گرمی جاں شام زمستاں کے لیے بھی

شہروں سے نکل کر ترے دیوانے کہاں جائیں
کم پڑنے لگے دشت غزالاں کے لیے بھی

اب یوں ہے کہ ہنگامہ محفل میں ہیں خاموش
مشہور تھے جو ہوئے بیاباں کے لیے بھی



عجیب نشہ ہے ہشیار رہنا چاہتا ہوں
میں اس کے خواب میں بیدار رہنا چاہتا ہوں

یہ موج تازہ مری تشنگی کا وہم سہی
میں اس سراب میں سرشار رہنا چاہتا ہوں

سیاہ چشم ، مری وحشتوں پہ طنز نہ کر
میں قاتلوں سے خبردار رہنا چاہتا ہوں

یہ درد ہی مرا چارہ ہے تم کو کیا معلوم
ہٹاؤ ہاتھ میں بیمار رہنا چاہتا ہوں

ادھر بھی آئے گی شاید وہ شاہ بانوے شہر
یہ موج کر سر بازار رہنا چاہتا ہوں

ہوا گلاب کو چھو کر گذرتی رہتی ہے
سو میں بھی اتنا گنگار رہنا چاہتا ہوں



کنارِ سوتھ بنا ہے کنارِ رُکنا باد
مثالِ تیغِ رواں چل رہی ہے بادِ مراد

ہمارے کنجِ ابدِ عافیت میں کچھ بھی نہیں
یہ کارِ گاہِ عناصرِ یہ عالمِ ایجاد

یہ دل بھی دیکھ کہ اس خانہِ باغِ ہجراں میں
وہی ہے آج بھی جاناں نظامِ بست و کشاد

سوا و یاد میں چھائی ہوئی ہیں چھاؤنیاں
مسافرانِ جہانِ وصالِ زندہ باد

پسِ غبارِ مسافت چراغِ جلتے رہیں
خدا رکھے یہ پراسرار بستیاں آباد

اب اس کے آگے جو کچھ فیصلہ ہو قسمت کا
ترے سمند بھی میرے غزال بھی آزاد

فقیر جاتے ہیں پھیرا لگا کے ڈیرے کو
مدام دولتِ دولتِ سرائے یارِ زیاد



بدن میں جیسے لہو تازیانہ ہو گیا ہے
اُسے گلے سے لگائے زمانہ ہو گیا ہے

چمک رہا ہے افق تک غبار تیرہ شہی
کوئی چراغ سفر پر روانہ ہو گیا ہے

ہمیں تو خیر بکھرنا ہی تھا کبھی نہ کبھی
ہوائے تازہ کا جھونکا بہانہ ہو گیا ہے

غرض کہ پوچھتے کیا ہو مالِ سوختگاں
تمام جلنا جلانا فسانہ ہو گیا ہے

فضائے شوق میں اس کی بساط ہی کیا تھی
پرند اپنے پروں کا نشانہ ہو گیا ہے

کسی نے دیکھے ہیں پت جھڑ میں پھول کھلتے ہوئے
دل اپنی خوش نظری میں دوانہ ہو گیا ہے



دل پہ یہ مشقِ ستارہ نظری آخر کیوں
پارہ سنگ کی آئینہ گری آخر کیوں

میں ہی کیوں حلقہ زنجیر تعلق میں اسیر
تو ہر الزامِ تعارف سے بری آخر کیوں

شاعری میں تو بہت دشت و بیابان کا ذکر
زندگی میں گلہ در بدری آخر کیوں

اب کہیں کوئی تقاضا نہ کوئی شرط وصال
مجھ سے آگے مری شوریدہ سری آخر کیوں

دشتِ ہجراں کے کڑے کوس تو سب کے لیے ہیں
میں ہی ارمان کروں ہم سفری آخر کیوں

دل اگر لہر میں آئے تو اڑا کر لے جائے
عشق میں شکوہ بے بال و پری آخر کیوں



یہ درد رات مرے بے خبر کے نام تمام
اُسی چراغِ جہانِ دگر کے نام تمام

کبھی جو زحمتِ کارِ رفو نہیں کرتا
ہمارے زخمِ اسی چارہ گر کے نام تمام

وہ ایک خوابِ سہی سایہ سرابِ سہی
یہ عمر بھر کی تھکنِ اک شجر کے نام تمام

کسی نے بند کیا ہم پہ اپنے نام کا رزق
تو ہم بھی بھول گئے خشک و تر کے نام تمام

یہ ربط حرف و حکایت اُسے قبول نہیں
تو اب ہمارے یہ خط نامہ بر کے نام تمام

یہ پھول جس نے کھلائے ہمارے پت جھڑ میں
اسی کے موسمِ برگ و ثمر کے نام تمام

اس ایک نام نے بخشا ہے جو خزانہ درد
وہ ہم نے وقف کیا بحر و بر کے نام تمام



توڑ دی اُس نے وہ زنجیر ہی دلداری کی
اور تشویر کرو اپنی گرفتاری کی

ہم تو صحرا ہوئے جاتے تھے کہ اُس نے آکر
شہر آباد کیا نہر صبا جاری کی

ہم بھی کیا شے ہیں طبیعت ملی سیارہ شکار
اور تقدیر ملی آہوے تاتاری کی

اتنا سادہ ہے مرا مایہ خوبی کہ مجھے
کبھی عادت نہ رہی آئینہ برداری کی

مرے گم گشتہ غزالوں کا پتہ پوچھتا ہے
فکر رکھتا ہے مسیحا مری بیماری کی

اس کے لہجے میں کوئی چیز تو شامل تھی کہ آج
دل پہ اس حرفِ عنایت نے گراں باری کی



(اپنے نام)

جاؤ، اب دشت ہی تعزیر تمہارے لیے ہے
پھر نہ کہنا کوئی زنجیر تمہارے لیے ہے

اپنے ہی دستِ تہی ظرف نے مارا تم کو
اب بکھر جانا ہی اکیر تمہارے لیے ہے

آخرِ شب تمہیں آنکھوں کا بھرم کھونا تھا
اب کوئی خواب نہ تعبیر تمہارے لیے ہے

عکسِ نظارہ کرو زودِ پشیمانی کا
اب تمہاری یہی تصویر تمہارے لیے ہے

آج سے تم پہ درِ حرف و نوا بند ہوا
اب کوئی لفظ نہ تاثیر تمہارے لیے ہے

مضبِ درد سے دل نے تمہیں معزول کیا
تم سمجھتے تھے یہ جاگیر تمہارے لیے ہے



کہیں خرابہ جاں کے مکیں نہیں جاتے
درخت چھوڑ کے اپنی زمیں نہیں جاتے

تھکے ہوئے کسی لمبے سفر سے لوٹے ہیں
ہوائے تازہ ابھی ہم کہیں نہیں جاتے

بہت یقین ترے دستِ رفو پہ ہے لیکن
میں کیا کروں مرے زخمِ یقین نہیں جاتے

یہ کون ہیں جو بہولوں سے چھاؤں مانگتے ہیں
ادھر جو ایک شجر ہے وہیں نہیں جاتے

میں تم سے ملنے کو اس شہرِ شب سے آتا ہوں
جہاں تم ایسے ستارہ جہیں نہیں جاتے

یہ جانتے ہوئے ہم پانیوں میں اترے ہیں
کہ ڈر نے والے بھنور کے قریں نہیں جاتے



جب وہم ہے وہ شکل تو حیراں نہ کر مجھے
اے چشم اعتبار پریشاں نہ کر مجھے

اس روشنی میں تیرا بھی پیکر نظر نہ آئے
اچھا یہ بات ہے تو فروزاں نہ کر مجھے

آئینہ سکوت نہ رکھ سب کے رو بہ رو
میں دل پہ نقش ہوں تو نمایاں نہ کر مجھے

یوسف نہیں ہوں مصر کے بازار میں نہ بیچ
میں تیرا انتخاب ہوں ارزاں نہ کر مجھے

کون ایسی بستیوں سے گذرتا ہے روز روز
میرے کرشمہ ساز، بیاباں نہ کر مجھے

میں برگ ریز ہجر میں زندہ نہ رہ سکوں
اتنا اُمیدوار بہاراں نہ کر مجھے



مجھے بچا بھی لیا، چھوڑ کر چلا بھی گیا
وہ مہرباں پسِ گردِ سفر چلا بھی گیا

وگر نہ تنگ نہ تھی عشق پر خدا کی زمین
کہا تھا اُس نے تو میں اپنے گھر چلا بھی گیا

کوئی یقیں نہ کرے میں اگر کسی کو بتاؤں
وہ اُنگلیاں تھیں کہ زخمِ جگر چلا بھی گیا

مرے بدن سے پھر آئی گئے دنوں کی مہک
اگرچہ موسمِ برگ و ثمر چلا بھی گیا

ہوا کی طرح نہ دیکھی مری خزاں کی بہار
کھلا کے پھول مرا خوش نظر چلا بھی گیا

عجیب روشنیاں تھیں وصال کے اُس پار
میں اُس کے ساتھ رہا اور اُدھر چلا بھی گیا

کل اُس نے سیر کرائی نئے جہانوں کی
تو رنجِ تارسیِ بالِ وپر چلا بھی گیا



اُس سے بچھڑ کے باب ہنر بند کر دیا
ہم جس میں جی رہے تھے وہ گھر بند کر دیا

شاید خبر نہیں ہے غزالانِ شہر کو
اب ہم نے جنگلوں کا سفر بند کر دیا

اپنے لہو کے شور سے تنگ آچکا ہوں میں
کس نے اسے بدن میں نظر بند کر دیا

اب ڈھونڈ اور قدرشنا سانِ رنگ و بو
ہم نے یہ کام اے گلِ تر بند کر دیا

اک اسمِ جاں پہ ڈال کے خاکِ فرامشی
اندھے صدف میں ہم نے گھر بند کر دیا



شعلہ عشق بجھا نا بھی نہیں چاہتا ہے
وہ مگر خود کو جلانا بھی نہیں چاہتا ہے

اُس کو منظور نہیں ہے مری گرا ہی بھی
اور مجھے راہ پہ لانا بھی نہیں چاہتا ہے

جب سے جانا ہے کہ میں جان سمجھتا ہوں اُسے
وہ ہرن چھوڑ کے جانا بھی نہیں چاہتا ہے

سیر بھی جسم کے صحرا کی خوش آتی ہے مگر
دیر تک خاک اڑانا بھی نہیں چاہتا ہے

کیسے اُس شخص سے تعبیر پہ اصرار کریں
جو کوئی خواب دکھانا بھی نہیں چاہتا ہے

اپنے کس کام میں لائے گا بتاتا بھی نہیں
ہم کو اردوں پہ گنونا بھی نہیں چاہتا ہے

میرے لفظوں میں بھی چھپتا نہیں پیکر اُس کا
دل مگر نام بتاتا بھی نہیں چاہتا ہے



مرے وجود کا جنگل ہرا بھرا ہو جائے
وہ رُت بھی آئے کہ اس کا بدن گھٹا ہو جائے

وہ مجھ کو حرف و نوا سے زیادہ جانتا ہے
میں کچھ نہ بولوں اور اُس سے مکالمہ ہو جائے

عجب ہے میرے ستارہ ادا کی ہم سفری
وہ ساتھ ہو تو بیاباں میں رتجگا ہو جائے

مجھے وہ لفظ جو لکھے 'تو کوئی اور لگے
سخن کرے کبھی مجھ سے تو دوسرا ہو جائے

وہ خوش بدن ہے نوید بہار میرے لیے
میں اس کو چھو لوں تو سب کچھ نیا نیا ہو جائے



بچے گا اب نہ کوئی بادِ باں سفینے میں
نہ جانے کیسی ہوا چل رہی ہے سینے میں

فضا میں اُڑتے ہوئے بادلوں سے یاد آیا
کہ میں اسیر ہوا تھا اسی مہینے میں

وہ رک گیا تھا مرے بام سے اُترتے ہوئے
جہاں پہ دیکھ رہے ہو چراغِ زینے میں

نکال دی ہے خدا نے نباہ کی صورت
ہمارے سنگ میں اور تیرے آگینے میں

بدن کی خاک میں کب سے دبا تھا شعلہ عشق
عجیب چیز ملی ہے مجھے دفینے میں



عجب نہیں وہ سمجھ لے یہ استعارہ شام
کہ آج دیر سے نکلا مرا ستارہ شام

یہ کون میرے بدن میں طلوع ہونے لگا
ابھی لہو کو ملا بھی نہیں اشارہ شام

چھپا نظر سے جو میرا ہلال ماہِ وصال
اُتر گیا مرے دل میں سیاہ پارہ شام

سمٹی دھوپ ترے ر وپ کی سیلی تھی
پنھا گئی ترے کانوں میں گوشوارہ شام

ہر آفتاب کو آخر غروب ہوتا ہے
سو ہم بھی ڈوب رہے ہیں سرِ کنارہ شام



ہوا کا چلنا، درپچوں کا باز ہو جانا
ذرا سی بات پہ دل کا گداز ہو جانا

مرے کنار سے اٹھنا مرے ستارے کا
اور اس کے بعد شبوں کا دراز ہو جانا

وہ میرے شیشے پہ آنا تمام گردِ ملال
پھر ایک شخص کا آئینہ ساز ہو جانا

وہ جاگنا مری خاکِ بدن میں نغموں کا
کسی کی انگلیوں کا نے نواز ہو جانا

خیال میں ترا کھلنا مثالِ بندِ قبا
مگر گرفت میں آنا تو رازِ ہو جانا

میں اس زمیں پہ تجھے چاہنے کو زندہ ہوں
مجھے قبول نہیں بے جوازِ ہو جانا



بدن کے دونوں کناروں سے جل رہا ہوں میں
کہ چھو رہا ہوں تجھے اور پگھل رہا ہوں میں

بجھتی پہ ختم ہے جاناں مرے زوال کی رات
تو اب طلوع بھی ہو جا کہ ڈھل رہا ہوں میں

بلا رہا ہے مرا جامہ زیب ملنے کو
تو آج پیرہن جاں بدل رہا ہوں میں

غیار راہ گذر کا یہ حوصلہ بھی تو دیکھ
ہوائے تازہ ترے ساتھ چل رہا ہوں میں

میں خواب دیکھ رہا ہوں کہ وہ پکارتا ہے
اور اپنے جسم سے باہر نکل رہا ہوں میں



کب سے راضی تھا بدن بے سرو سامانی پر
شب میں حیران ہوا خون کی طغیانی پر

ایک چکار نے سنائے کا توڑا پندار
ایک نو برگ ہنسا دشت کی ویرانی پر

کل بگولے کی طرح اس کا بدن رقص میں تھا
کس قدر خوش تھی مری خاک پریشانی پر

میری ہونٹوں سے جو سورج کا کنارہ ٹوٹا
بن گیا ایک ستارہ تری پیشانی پر

کون سا شہر سبا فتح کیا چاہتا ہوں
لوگ حیراں ہیں مرے کارِ سلیمانی پر



اب وہ بے تانی جاں کا ہے کی ، وحشت کیسی
اُس سے بچھڑے ہیں تو حاصل ہے فراغت کیسی

جان، ہم کارِ محبت کا صلہ چاہتے تھے
دلِ سادہ کوئی مزدور ہے اجرت کیسی

عمر کیا چیز ہے احساسِ زیاں کے آگے
ایک ہی شب میں بدل جاتی ہے صورت کیسی

شمع خیمہ کوئی زنجیر نہیں ہم سفرِاں
جس کو جانا ہے چلا جائے اجازت کیسی

اس زمیں پر مرے یکتا ترے تمثال بہت
آئینہ خانے میں آیا ہے تو حیرت کیسی

دل اگر دل ہے تو دریا سے بڑا ہونا ہے
سر اگر سر ہے تو نیزوں سے شکایت کیسی



ہم نے اُسے محبوب کیا یہ سوچ کے جی میں غرور کرے
دل سے ہمیں فرزا نہ جانے دیوانہ مشہور کرے

اُس کا نام ہی اتم رُ ہے میری صدا کے سرگم کا
اس کے آگے سنا ہے کوئی اگر مجبور کرے

حرف میں اپنے جانِ سخن نے دونوں مطلب رکھے ہیں
جب چاہے افسرِ دہ کردے ، جب چاہے مسرور کرے

کیا کیا طور اُسے آتے ہیں دل کو شکبہا رکھنے کے
لغزش پر ناراض نہ ہو اور خواہش نا منظور کرے

شب کو جو مجھ خوابِ گراں ہو گل ہوں ستارے چاند چراغ
صبح کو جب وہ جامہ چسپاں ہو جگ میں نور ظہور کرے

ہم کو تو دلبرِ خوب ملا خیر اپنی اپنی قسمت ہے
پھر بھی جو کوئی رنج اٹھانا چاہے عشق ضرور کرے



ابھی کھلنے کے لیے بندِ قبا رکھا ہے
ہم نے ہر کام کو فردا پہ اٹھا رکھا ہے

کیا چھپاؤں مرے دلدار کہ تیرے آگے
دل کفِ دست کے مانند کھلا رکھا ہے

ہے مری خاکِ بدن آئینہ گر تیرا کمال
تو نے کس چیز کو آئینہ بنا رکھا ہے

کیسی آنکھیں ہیں کہ دریاؤں کو پہچانتی ہیں
کیسا دل ہے کہ سراپوں سے لگا رکھا ہے

ہم تعارف ہی سے دیوانے ہوئے جاتے ہیں
اور ابھی مرحلہ کارِ وفا رکھا ہے

ایک ہی رنگ ترے اسمِ دلاویز کا رنگ
اور میرے ورقِ سادہ میں کیا رکھا ہے



بے دلاں ، کارِ نظر ختم کہاں ہوتا ہے
رُک بھی جائیں تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے

نیند سے پہلے بہت شور مچاتے ہیں خیال
شب کو ہنگامہ سر ختم کہاں ہوتا ہے

چاہتا کون ہے مرنے کی اذیت سے نجات
زہر تو ، ہے تو اثر ختم کہاں ہوتا ہے

اگلے موسم میں پھر آئیں گے نئے برگ و ثمر
اے ہوا بارِ شجر ختم کہاں ہوتا ہے

اپنی ہی آگ سے روشن ہوں میں اک ذرّہ خاک
دیکھئے رقصِ شرر ختم کہاں ہوتا ہے

بولتے بولتے ہو جاتے ہیں خاموش چراغ
سُخنِ سایہ در ختم کہاں ہوتا ہے



تم بادِ صبا کلاؤ تو کیا
کچھ دیر میں ہم مُرجھانے کو ہیں

کوئی آ کے ہمیں زنجیر کرے
ہم رقصِ جنوں فرمانے کو ہیں

جو بادل بستی چھوڑ گئے
کس بن پہ بھرن برسانے کو ہیں

اب جاؤ ہمارے دھیان سے تم
ہم پل بھر جی بہلانے کو ہیں

جس شہر سے اُس نے کوچ کیا
ہم کون وہاں رہ جانے کو ہیں

دل کیسے ریت میں ڈوب گیا
آنکھیں تو دھوکا کھانے کو ہیں

اب ہونٹوں پر کوئی ہاتھ نہیں
ہم دل کی بات بتانے کو ہیں



تو انہیں یاد آئے گی اے جو بہار اگلے برس
اب تو لوٹے گی پرندوں کی قطار اگلے برس

اور کچھ دن اُس سے ملنے کے لیے جاتے رہو
بستیاں بس جائیں گی دریا کے پار اگلے برس

پہلے ہم پچھلی رتوں کے درد کا کر لیں حساب
اس برس کے سارے زخموں کا شمار اگلے برس

تم تو سچے ہو مگر دل کا بھروسہ کچھ نہیں
بجھ نہ جائے یہ چراغ انتظار اگلے برس

میں نے موسم میں برگِ تازہ بن کر آؤں گا
پھر ملیں گے اے ہوائے شاخسار اگلے برس



کوئی چٹھی لکھو رنگ بھری کوئی مٹھی کھولو پھاگ بھری
کبھی دن بیتیں بیراگ بھرے کبھی رُت آئے انور اگ بھری

جہاں خاک بچھو نارات ملے مجھے چاند کی صورت ساتھ ملے
وہی دکھیا رن وہی بنجارن وہی روپ متی وہی بھاگ بھری

پل بھر کو اگر میں سو جاؤں تو سارا زہر کا ہو جاؤں
ترا کالا جنگل ناگ بھرا مری جلتی آنکھیں جاگ بھری

سنو اپنا اپنا کام کریں سرتال پہ کیوں الزام دھریں
میاں اپنی اپنی بانسریا کوئی راگ بھری کوئی آگ بھری



فقیروں ہوں دل تکیہ نشیں ملا ہے مجھے
میاں کا صدقہ تاج و نگیں ملا ہے مجھے

زباں کو خوش نہیں آتا کسی کا آب و نمک
عجب تبرک نانِ جویں ملا ہے مجھے

میں بویا بھی اسی خاک پر کیا تھا بساط
سو یہ خریطہ زر بھی یہیں ملا ہے مجھے

چراغِ گنبد و محراب بجھ گئے ہیں تمام
تو اک ستارہ داغِ جبیں ملا ہے مجھے

یہ سر کہاں وہ کلاہ چہار ترک کہاں
ابھی اجازۂ بیعت نہیں ملا ہے مجھے



ہر طرف ڈوبتے سورج کا سماں دیکھئے گا
اک ذرا منظر غرقابی جاں دیکھئے گا

سیرِ غرناطہ و بغداد سے فرصت پا کر
اس خرابے میں بھی خوابوں کے نشان دیکھئے گا

یہ در و بام یہ چہرے یہ قبائیں یہ چراغ
دیکھئے بارِ دگران کو کہاں دیکھئے گا

راہ میں اور بھی قاتل ہیں اجازت لیجئے
جیتے رہے گا تو پھر کوئے بتاں دیکھئے گا

شاخ پر جھومتے رہنے کا تماشا کیا ہے
کبھی صر صر میں ہمیں رقص کناں دیکھئے گا

یہی دُنیا ہے تو اس تیغ مکافات کی دھار
ایک دن گردنِ خنجر پہ رواں دیکھئے گا

دل طرفدارِ حرم جسم گرفتارِ فرنگ
ہم نے کیا وضع نکالی ہے میاں دیکھئے گا



نخن میں رنگ تمہارے خیال ہی کے تو ہیں
یہ سب کرشمے ہوائے وصال ہی کے تو ہیں

کہا تھا تم نے کہ لاتا ہے کون عشق کی تاب
سو ہم جواب تمہارے سوال ہی کے تو ہیں

ذرا سی بات ہے دل میں اگر بیاں ہو جائے
تمام مسئلے اظہار حال ہی کے تو ہیں

یہاں بھی اس کے سوا اور کیا نصیب ہمیں
نخن میں رد کے بھی چشم غزال ہی کے تو ہیں

جسارتِ سخنِ شاعراں سے ڈرنا کیا
غریب مشغلہِ قیل و قال ہی کے تو ہیں

ہوا کی زد پہ ہمارا سفر ہے کتنی دیر
چراغِ ہم کسی شامِ زوال ہی کے تو ہیں



ہم سخن ہوتا ہے صحرا کا وہ آہو ہم سے
پوچھیے دور کی آواز کا جادو ہم سے

لیے پھرتی تھی کسی شہر فراموشی میں
رات پھر کھیل رہی تھی تری خوشبو ہم سے

اپنے لفظوں سے اُسے ہم نے سنبھلنے نہ دیا
ہو گئے دل میں کئی تیر ترازو ہم سے

کیا جھلکتا ہے یہ جاناں تری خاموشی میں
حرف اقرار تو کہتا بھی نہیں تو ہم سے

ہم کبھی دھیان سے اُس کے نہ اُترنے پائیں
دائم آباد رہے حسن کا پہلو ہم سے



کیا ہرن ہے کہ کبھی رم نہیں کرتا ہم سے
فاصلہ اپنا مگر کم نہیں کرتا ہم سے

پیکرِ سادہ ہے اور دل سے وہ کرتا ہے سلوک
جو کبھی حُسنِ دو عالم نہیں کرتا ہم سے

خود ہی شاداب ہے وہ لالہ صحرا ایسا
خواہشِ قطرہٗ شبنم نہیں کرتا ہم سے

کیا خبر کون سی تقصیر پہ ناراض نہ ہو
وہ شکایت بھی تو پیہم نہیں کرتا ہم سے

صبرِ اے عشق، وہ خواہاں ہے شکیبائی کا
طلبِ دیدہٗ پرُ نم نہیں کرتا ہم سے



چراغِ خانہ افسردگاں جلائے بھی
اگر وہ سنگ نہیں ہے تو مسکرائے بھی

وہ چاند ہے تو مرے بام پر طلوع بھی ہو
ستارہ ہے تو مری شام جگمگائے بھی

وہ پھول ہے تو مری شاخ جاں بھی مہکائے
اگر ہوا ہے تو میرے بدن تک آئے بھی

وہ شعلہ ہے تو مجھے خاک بھی کرے آخر
اگر دیا ہے تو کچھ اپنی لو بڑھائے بھی

نخن سرا ہے تو مجھ سے مکالمہ بھی کرے
گلہ نئے بھی اور اپنی غزل سنائے بھی



جاں سے گذرے بھی تو دریا سے گذاریں گے تمہیں
ساتھ مت چھوڑنا ہم پار اُتاریں گے تمہیں

تم سنو یا نہ سنو ، ہاتھ بڑھاؤ نہ بڑھاؤ
ڈوبتے ڈوبتے اک بار پکاریں گے تمہیں

دل پہ آتا ہی نہیں فصلِ طرب میں کوئی پھول
جان، اس شاخِ شجر پر تو نہ داریں گے تمہیں

کھیل یہ ہے کہ کسے کون سوا چاہتا ہے
جیت جاؤ گے تو جاں نذر گذاریں گے تمہیں

کیسی زیبائی ہے جب سے تمہیں چاہا ہم نے
اور چاہیں گے تمہیں اور سنواریں گے تمہیں

عشق میں ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے لیکن
کم سے کم معرکہ جاں میں نہ ہاریں گے تمہیں



تو وہاں ہو تو گرفتارِ خُشن ہو جاؤں
میں کہاں جاؤں کہ پھر تیرا ہرن ہو جاؤں

شہرِ بلقیس میں ہونے کی خبر آئے تو میں
شاملِ خاک نشینانِ یمن ہو جاؤں

یاد آئیں جو تری کم سخی کے انداز
اپنے ہی آپ سے مصروفِ سخن ہو جاؤں

روح میں کیسی تھکن ہے کوئی تدبیر کروں
شاید آسودہ سرِ بسترِ تن ہو جاؤں

کب سے پتھر ہوں بیابانِ فراموشی میں
میرے ساحر مجھے چھولے کہ بدن ہو جاؤں



جسم و جاں کی آگ سے منظر بہ منظر روشنی
اُس کا پیکر روشنی میرا مقدر روشنی

میں نے رات اک خواب دیکھا اور روشن ہو گیا
دیکھتا کیا ہوں کہ ہے میرے برابر روشنی

اور اے روشن قبا تجھ سے ہمیں کیا چاہیے
ایک دامن بھر ہوا اور اک دیا بھر روشنی

میں کوئی جگنو نہ تارا ، میں کوئی سورج نہ چاند
اور تو تو دیکھے تو ہے مٹی کے اندر روشنی

اکثر اکثر اُس کا چہرہ دھیان میں آتا بھی ہے
جیسے گم ہو جائے جنگل میں چمک کر روشنی

میرے مولا، ہجر کی تاریک راتوں کے طفیل
زندگی بھر چاہتیں اور زندگی بھر روشنی



یمن ویراں ہوا اب دل کی جولانی سے کیا ہوگا
نقیب و لشکر و تختِ سلیمان سے کیا ہوگا

قبا سے کیا ہوا ہنگامہ شوقِ تماشا میں
ہم آنکھیں بند کر لیں گے تو عریانی سے کیا ہوگا

مری دُنیا ے جاں میں صرف میرا حکم چلتا ہے
بدن کی خاک پر او روں کی سلطانی سے کیا ہوگا

یہاں کس کو خبر ہوگی غبارِ شہ سواراں میں
میں خوشبو ہی سہی میری پریشانی سے کیا ہوگا

پھر اک نو برگ نے روے بیاباں کر دیا روشن
میں ڈرتا تھا کہ حاصل ایسی ویرانی سے کیا ہوگا



میرے ہونے میں کسی طور سے شامل ہو جاؤ
تم مسیحا نہیں ہوتے ہو تو قاتل ہو جاؤ

دشت سے دُور بھی کیا رنگ دکھاتا ہے جنوں
دیکھنا ہے تو کسی شر میں داخل ہو جاؤ

جس پہ ہوتا ہی نہیں خون دو عالم ثابت
بڑھ کے اک دن اسی گردن میں حماکل ہو جاؤ

وہ ستم گر تمہیں تسخیر کیا چاہتا ہے
خاک بن جاؤ اور اُس شخص کو حاصل ہو جاؤ

عشق کیا کارِ ہوس بھی کوئی آسان نہیں
خیر سے پہلے اسی کام کے قابل ہو جاؤ

ابھی پیکر ہی جلا ہے تو یہ عالم ہے میاں
آگ یہ روح میں لگ جائے تو کامل ہو جاؤ

میں ہوں یا موج فنا اور یہاں کوئی نہیں
ٹم اگر ہو تو ذرا راہ میں حائل ہو جاؤ



کچھ حرف و سخن پہلے تو اخبار میں آیا
پھر عشق مرا کوچہ و بازار میں آیا

اب آخرِ شب درد کا بھٹکا ہوا رہوار
آیا بھی تو شراب و رخسار میں آیا

کیا نقش ہوا دل کے اندھیرے میں نمودار
کیا روزِ روشن مری دیوار میں آیا

حیراں ہوں کہ پھر اُس نے نہ کی صبر کی تاکید
بازو جو مرا بازوئے دلدار میں آیا

یہ آئنے گفتار کوئی اور ہے مجھ میں
سوچا بھی نہ تھا میں نے جو اظہار میں آیا

حاصل نہ ہوا مجھ کو وہ مہتاب تو معبود
کیا فرق ترے ثابت وسیار میں آیا



میں جب تازہ تر تھا تو اکثر تھوڑ میں عکسِ رخِ دیگر اں کھینچتا تھا
شبہیں بناتا تھا اور اُن کے اطراف نقش و نگارِ گماں کھینچتا تھا

کسی شہرِ فرداے امن و اماں کی کرن اپنی جانب بُلّاتی تھی مجھ کو
اور اپنی طرف ایک خیمے میں روشن چراغِ شبِ درمیاں کھینچتا تھا

عجب سلسلہ تھا وہ جنگِ آزما خاک پر جاں بہ لب چھوڑ جاتے تھے مجھ کو
پسِ معرکہ ایک دستِ کرم میرے سینے سے نوکِ سناں کھینچتا تھا

یہی شخص جو اب جہانِ مکافات میں قاتلوں سے اماں چاہتا ہے
کبھی پھینکتا تھا کمندِ آہوؤں پر کبھی طاروؤں پر کماں کھینچتا تھا

وصالِ بتاں کے لیے سوزِ جاں، عشق کا امتحاں، کچھ ضروری نہیں ہے
سوابِ جا کے مجھ پر کھلا ہے کہ میں اتنے رنج و محنِ رانگاں کھینچتا تھا



زیرِ محراب نہ بالائے مکاں بولتی ہے
خامشی آکے سرِ خلوت جاں بولتی ہے

یہ مرا وہم ہے یا مجھ کو بلاتے ہیں وہ لوگ
کان بجتے ہیں کہ موجِ گذراں بولتی ہے

لو سوالِ دہنِ بستہ کا آتا ہے جواب
تیر سرگوشیاں کرتے ہیں کماں بولتی ہے

ایک میں ہوں کہ اس آشوبِ نوا میں چپ ہوں
ورنہ دنیا مرے زخموں کی زباں بولتی ہے

ہو کا عالم ہے گرفتاروں کی آبادی میں
ہم تو سنتے تھے کہ زنجیر گراں بولتی ہے

درد کے باب میں تمثال گری ہے خاموش
بن بھی جاتی ہے تو تصویر کہاں بولتی ہے



پرند نامہ بری میں کہاں سے آتے ہیں
سخن یہ بے خبری میں کہاں سے آتے ہیں

ہمیں بھی یاد نہیں ہے کہ ہم شرر کی طرح
ہوا کی ممسفری میں کہاں سے آتے ہیں

مسافیتیں کوئی دیکھے کہ ہم سراپوں تک
گمان خوش نظری میں کہاں سے آتے ہیں

گہروں میں آنکھیں دروں میں چراغ جلتے ہوئے
یہ خواب در بدری میں کہاں سے آتے ہیں

یہ کون جادہ گم گشتگاں اُجالتا ہے
فرشتے دشت و تری میں کہاں سے آتے ہیں

اگر تراوشِ زخمِ جگر نہیں کوئی چیز
تو رنگ بے ہنری میں کہاں سے آتے ہیں



خوابِ آسودگیِ بالِ دہرِ آنے کا نہیں
شامِ آنکھوں سے یہ کہتی ہے گھر آنے کا نہیں

دل کے آئینے سے رخصت ہو ا زنگارِ ملال
اس میں اب کوئی بھی چہرا نظر آنے کا نہیں

اور کیا چاہئے پیروں سے گریزاں ہے زمیں
آسمانوں سے تو اذنِ سفر آنے کا نہیں

فیصلہ کر، کم و بیشِ تیرِ دریا کی نہ سوچ
مسئلہ ڈوبنے کا ہے اُبھر آنے کا نہیں

کل اُسی موج میں بہنا تھا تو بہہ جانا تھا
جانِ من، اب کوئی سیلاب ادھر آنے کا نہیں

جس کو ہونا ہے وہ فریاد میں شامل ہو جائے
بے نوا شہر میں بارِ دگر آنے کا نہیں

کوئے قاتل کی روایت ہی بدل دی میں نے
ورنہ دستور یہاں لوٹ کر آنے کا نہیں



لشکرِ عشق نے جب سے خیمے کیے کچھ نہ کچھ روز سر حد بڑھالی گئی
اور پھر ایک دن دل کی ساری زمیں درد کی مملکت میں ملا لی گئی

رات کو رک کے صحرا جگایا گیا جب تھکن سے بدن کی طنائیں گریں
اپنے ہاتھوں کے تکیے بنائے گئے اپنی مٹی کی چادر بچھالی گئی

ایک چڑیا کی آواز آتی رہی میرے بچوں کو مجھ سے چھڑایا گیا
میری بستی سے مجھ کو نکالا گیا میرے جنگل میں بستی بسالی گئی

دستِ خالی پہ کیا حوصلہ کیجئے کیسے جینے کی قیمت ادا کیجئے
اب کے دربار میں نذرِ سر بھیج کر بچ نکلنے کی صورت نکالی گئی

کوچہ رہزناں سے گذرتے ہوئے کچھ بچانا بھی تھا کچھ لٹانا بھی تھا
اپنی صدیوں کا سونا لٹایا گیا اپنے خوابوں کی دنیا بچالی گئی

ختم ہوتا ہے اُس رات کا ماجرا اب یہ کیا پوچھتے ہو کہ پھر کیا ہوا
پھر چراغوں کی آنکھیں بھادی گئیں پھر گلوں کی زباں کاٹ ڈالی گئی

سارے منظر غبارِ پس کا رواں ہو گئے بام و در سب دھواں ہو گئے
اب مناجات کا وقت ہے گھر چلو سیر کی جا چکی خاک اُڑالی گئی



ہم تو زنجیر سفر شوق میں ڈالے ہوئے ہیں
ورنہ یہ نفس و آفاق کھنگالے ہوئے ہیں

جان و تن عشق میں جل جائیں گے، جل جانے دو
ہم اسی آگ سے گھر اپنا اُجالے ہوئے ہیں

کب سے مثر گاں نہیں کھولے مرے ہشیاروں نے
کتنی آسانی سے طوفان کو ٹالے ہوئے ہیں

اجنبی جان کے کیا نام و نشان پوچھتے ہو
بھائی، ہم بھی اسی بستی کے نکالے ہوئے ہیں

ہم نے کیا کیا تجھے چاہا ہے انھیں کیا معلوم
لوگ ابھی کل سے ترے چاہنے والے ہوئے ہیں

کہیں وحشت نہیں دیکھی تری آنکھوں جیسی
یہ ہرن کون سے صحراؤں کے پالے ہوئے ہیں

دل کا کیا ٹھیک ہے آنا ہے تو آجا کہ ابھی
ہم یہ گرتی ہوئی دیوار سنبھالے ہوئے ہیں



ہاں اے دل دیوانہ حریفانہ اُٹھا لے
دنیا نے جو پھینکا ہے وہ دستانہ اُٹھا لے

خاک اڑتی ہے سینے میں بہت رقص نہ فرما
صحرا سے مری جان پری خانہ اُٹھا لے

تم کیا شرِ عشق لیے پھرتے ہو صاحب
اس سے تو زیادہ ہر پروانہ اُٹھا لے

یار اتنے سے گھر کے لیے یہ خانہ بدوشی
سر پر ہی اُٹھانا ہے تو دنیا نہ اُٹھا لے

پھر بار فقیروں کا اٹھا تا مرے داتا
پہلے تو یہ کشلول فقیرانہ اٹھا لے

جو رنج میں اس دل پہ اٹھایا ہوں اُسے چھوڑ
تو صرف مرا نعرہ مستانہ اٹھالے

آسان ہو جینے سے اگر جی کا اٹھانا
ہر شخص ترا عشوہ ترکانہ اٹھالے

لو صبح ہوئی موج سحر خیز ادھر آئے
اور آکے چراغ شب افسانہ اٹھالے

ہم لفظ سے مضمون اٹھا لاتے ہیں جیسے
مٹی سے کوئی گوہر یک دانہ اٹھالے



تجھے پا کر بھی تیری ہی طلب سینے میں رکھتا ہوں
تماشا کر کہ میں کشلول گنجینے میں رکھتا ہوں

اسی رستے سے وہ خورشید فردا گھر میں اترے گا
سو آنکھوں کے دیئے اس رات کے زینے میں رکھتا ہوں

مجھے یہ زندگی نقصان کا سودا نہیں لگتی
میں آنے والی دنیا کو بھی تخمینے میں رکھتا ہوں

عزیزو تم سے رازِ خوش نوائی کیا چھپانا ہے
میں دل کے چند ٹکڑے اپنے سارینے میں رکھتا ہوں

مرا رنگِ ہنر تو ایک تصویرِ خیالی ہے
میں اک سادہ سا چہرا دل کے آئینے میں رکھتا ہوں



دیکھ لے ، خاک ہے کا سے میں کہ زر ہے سائیں
دستِ دادار بڑا شعبدہ گر ہے سائیں

تو مجھے اس کے خم و پیچ بتاتا کیا ہے
کوئے قاتل تو مری راہ گذر ہے سائیں

یہ جہاں کیا ہے بس اک صفحہ بے نقش و نگار
اور جو کچھ ہے ترا حُسنِ نظر ہے سائیں

شہر و صحرا تو ہیں انسانوں کے رکھے ہوئے نام
گھر وہیں ہے دلِ دیوانہ جدھر ہے سائیں

ہم نے پہلے بھی مآل شب غم دیکھا ہے
آنکھ اب کے جو کھلے گی تو سحر ہے سائیں

پاؤں کی فکر نہ کر بارِ کم و بیش اُتار
اصل زنجیر تو سامانِ سفر ہے سائیں

آگے تقدیر پرندے کی جہاں لے جائے
حدِ پرواز فقط حوصلہ بھر ہے سائیں

شاعری کون کرامت ہے مگر کیا کیجئے
درد ہے دل میں سو لفظوں میں اثر ہے سائیں

عشق میں کہتے ہیں فرہاد نے کانا تھا پہاڑ
ہم نے دن کاٹ دیئے یہ بھی بنر ہے سائیں



عشق میاں اس آگ میں میرا ظاہر ہی چمکا دینا
میرے بدن کی مٹی کو ذراکندن رنگ بنا دینا

آؤ تمہاری نذر کریں ہم ایک چراغ حکایت کا
جب تک جاگو روشن رکھنا نیند آئے تو بجھا دینا

بیس اکیس برس پیچھے ہمیں کب تک ملتے رہنا ہے
دیکھو، اب کی بار ملو تو دل کی بات بتا دینا

سینے کے دیرانے میں یہ خوشبو ایک کرامت ہے
ورنہ اتنا سہل نہیں تھا راکھ میں پھول کھلا دینا

دل کی زمیں تک روشنیاں تھیں، چہرے تھے، ہریالی تھی
اب تو جہاں بھی ساحل پانا کشتی کو ٹھہرا دینا

مولا، پھر مرے صحرا سے بن بر سے بادل لوٹ گئے
خیر، شکایت کوئی نہیں ہے اگلے برس برسا دینا

خواجہ خضر سنو ہم کب سے اس بستی میں بھٹکتے ہیں
تم کو اگر تکلیف نہ ہو تو جنگل تک پہنچا دینا



شہر کیوں رات میں بیدار ہے میں کیا جانوں
جشن ہے صبح کہ پیکار ہے میں کیا جانوں

ایک قطرہ بھی مرے کوزہ خالی میں نہیں
ہر طرف ابر گہرا ہے میں کیا جانوں

عاشقوں کے سر تسلیم کو تسلیم سے کام
اب یہ ابرو ہے کہ تلوار ہے میں کیا جانوں

حمید کرتا ہے کسی اور کی مرضی سے مجھے
خود بھی صیاد گرفتار ہے میں کیا جانوں

میں تو اک درد کا سرمایہ لیے بیٹھا ہوں
یہ مری جان کا آزار ہے میں کیا جانوں

میں تو اک بکھری ہوئی صف کا پیادہ ٹھہرا
کون اس فوج کا سالار ہے میں کیا جانوں

تو فرستادہ سرکار نہیں ہے نہ سہی
ہاتھ میں محضر سرکار ہے میں کیا جانوں

شحنہ شہر کی خدمت میں لگے ہیں سب لوگ
کو ن غالب کا طرفدار ہے میں کیا جانوں

اک نیا رنگ ہو یدا ہے مری آنکھوں میں
آج کیا سرخی اخبار ہے میں کیا جانوں

تجھ کو سیلاب کے آنے کی خبر دے دی ہے
تیرا در ہے تری دیوار ہے میں کیا جانوں

میں نمو کرنے پہ راضی نہیں بے موج بہار
موسمِ درہم و دینار ہے میں کیا جانوں

سرِ پندار تو مجھ کو بھی نظر آتا ہے
اور کیا کیا تیرے دستار ہے میں کیا جانوں

قحط میں کب سے دکان مری پڑی ہے خالی
عشق سے گرمی بازار ہے میں کیا جانوں

ہے کہیں صبحِ خوش آثار بھی لیکن فی الحال
میری آگے تو شبِ تار ہے میں کیا جانوں

مجھ کو آتی ہے ترے حرف سے احساس کی آنچ
سب تری گرمیِ گفتار ہے میں کیا جانوں



ہو چکا جو کچھ وہی بارِ دگر کرنا مجھے
پانیوں میں راستہ شعلوں میں گھر کرنا مجھے

تجھ کو اک جادو دکھانا پیچ و تابِ خاک کا
اک تماشا اے ہوائے رہ گزر کرنا مجھے

دھیرے دھیرے ختم ہونا سر کا سودا، دل کا درد
رفتہ رفتہ ہر صدف کو بے گھر کرنا مجھے

اپنے چاروں سمت دیواریں اٹھانا رات دن
رات دن پھر ساری دیواروں میں در کرنا مجھے



کہیں خیاں لگیں قریہ وصال بھی آئے
شبِ سفر میں کبھی ساعتِ زوال بھی آئے

کسی اُفق پہ تو ہوا اتصالِ ظلمت و نور
کہ ہم خراب بھی ہوں اور وہ خوش خصال بھی آئے

سخن میں کب سے ہے روشن ، یہ کیا ضروری ہے
کہ وہ ستارہ سرِ مطلعِ مثال بھی آئے

سنا ہے سیر کو نکلی ہوئی ہے موجِ نشاط
عجب نہیں طرفِ کوچہ ملال بھی آئے

ہمیں عطیہ ترکِ طلب قبول نہ تھا
سو ہم تو اس کی عنایت پہ خاک ڈال بھی آئے

